فکرِ اقبال میں بلندی کا تصور

فروغ احمد

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمین کے ہنگامے
بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

بانگ درا کی نظم ''ہمالہ'' سے لے کر جاوید نامہ کے باب ''آں سوئے افلاک'' تک کا زمانی فاصلہ خواہ کتنا کچھ بھی ہو' اوپر اٹھنے اور اوپر اٹھانے کا عمل اقبال کا وہ خاص کارنامہ ہے جو اسے بیسویں صدی کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے اور اسے زمینی حقائق سے ''کنارہ کشی'' یا ''فرار'' قرار دینا قرین انصاف نہیں۔

شبلی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اس دنیا میں تھا مگر دنیا کا نہیں تھا۔ شبلی علامتی پرندے سکائی لارک اور اقبال کے علامتی پرندے ''شاہین'' میں کئی پہلوؤں سے مماثلت محسوس کی جاسکتی ہے مثلاً یہی کہ شبلی کے ''سکائی لارک'' کی نگاہ بھی اپنے آشیانے پر مرکوز رہتی ہیں اور اقبال بھی اپنے ''شاہین'' کے بارے مین یہ دعویٰ کرتا ہے کہ

فضائے او فضائے بیکرانہ
نگاہ او بشاخ آشیانہ

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اوپر اٹھنے اور اٹھانے کے معاملے میں اقبال شبلی سے متاثر ہے۔ اسے اور بھی بہت سے مفکرین اور شعرا سے متاثر بتایا جاتا رہا ہے۔ متاثر دراصل وہ کسی سے نہیں۔ محض ظاہری مماثلت کی بنا پر کسی کو کسی سے

متاثر قرار دینا منطقی مغالطے پر مبنی ہوگا۔ زمانے کے تضادات سے بالاتر ہونے کے معاملے میں اقبال کو ملٹن سے بھی متاثر قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ یہ غالباً قرار دیا بھی گیا ہے۔ مگر یہ تو صریح منطقی تضاد ہے کہ بلندی پرواز کے معاملہ میں اقبال بیک وقت شیلی سے بھی متاثر ہو اور ملٹن سے بھی۔ مماثل وہ دونوں سے ہوسکتا ہے۔ متاثر کسی سے بھی نہیں۔ اس کے عرفان کا سرچشمہ اس کا اپنا تہذیبی اثاثہ ہے۔

اقبال نے ہمیں پسماندگی، رقابت، عداوت، نسلی، علاقائی اور گروہی افتراق، نفاق، ظاہرداری، تصنع اور تکلف سے بالاتر ہونے کی ترغیب اس طرح دلائی ہے کہ خیال کی دنیا میں اس کی ''کوہ پیمائی'' اور ''خلانوردی'' اس عہد حاضر کے کوہ پیماؤں اور خلانوردوں کی طرح تہذیبی مقصدیت اور ارضی افادیت کی حامل تھی۔ اس کے یہاں تلقین اس بات کی نہیں ہے کہ ہمیں بقول کسے ''پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا تو آجائے انسان کی طرح زمین پر چلنا نہ آئے'' اس کا ''سرود انجم'' (می نگریم و می رویم) دراصل اہل زمین کو راست روی کی تلقین ہے۔ شیلی تو زندگی کی تلخیوں سے بیزار تھا اسکے برخلاف اقبال نے صاف کہا۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اوپر اٹھنے کی بات اگر اس نے کہی تو اسی پس منظر میں کہی اس نے اپنے ایک پورے مجموعے کا نام بال جبریل اسی مقصد کے تحت رکھا۔ اور اس کے سرورق پر یہ شعر رقم کیا

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختہ شام و سحر تازہ کریں

''خورشید کا سامان سفر'' حیات ارضی کی رازگی کی خاطر!

اقبال کی ایک نظم ''سیر فلک'' کے بارے میں عطیہ فیضی کے نام سے اقبال کے ایک نجی خاط کی اشاعت کے بعد یہ معلوم ہوسکا کہ اس نظم کا خاص پس منظر کیا تھا۔ بیشک وہ کچھ نجی تلخیوں کے پس منظر میں تخلیق ہوئی۔ مگر کمال فن کاری اقبال کا یہ ہے کہ اس نے اپنے ذاتی غم کو غم زمانہ بنا دیا۔ عالم بالا میں جہنم کو سرد دیکھنا اور پھر اس پر یہ فقرہ چست کرنا کہ

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

ایک وقتی غضبناکی اور جذباتی ہیجان کی بات تھی مگر اس میں بھی وہ بڑے سنبھلے ہوئے انداز سے از راہ ابہام بڑا اخلاقی درس دے گیا۔ یہ سنبھلا ہوا انداز صرف ایسے مفکر کو نصیب ہوسکتا ہے جس کا دل پوری دنیا کی فلاح کے لیے تڑپتا ہو۔ ورنہ شبلی کی طرح وہ بھی اسی کا رونا رو سکتا تھا کہ ''میں زندگی کے خارزار پر گرتا ہون اور لہولہان ہوتا ہوں''۔

فکر اقبال میں بلندی کے تصور کو اوپر مقصدیت اور افادیت کا حامل قرار دیتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کی فکری پرواز ''دھرتی کے باسیوں کی فلاح و بہبود کی خاطر ہے'' اور یہی وہ خاص پہلو ہے جس نے اقبال کو فری

ماورائیت سے بچایا ہم دیکھتے ہیں کہ خواہ وہ ''ہمالہ'' کی چوٹی پر ہو یا اس کے قدم ''فلک'' پر ہوں۔ یا اس کی پرواز افلاک سے بھی آگے ہو بہر حال وہ اہل دنیا کے ''نفس سوختہ شام وسحر'' کو ''تازہ'' کرنے ہی کے لیے فکری اذران اور خلا نوردی کی زحمت گوارا کرتا ہے۔

بات ہمالہ سے شروع ہوئی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ ''جس شاعری کی ابتدا ہمالہ سے ہوئی ہو اس کی انتہا کیا ہوگی'' ابتدا خواہ ہمالہ ہو یا ''آن سوئے افلاک'' اقبال کی شاعری کی انتہا ''ارضی'' ہے جو جنت سے نکالے ہوئے آدم کا ''استقبال'' کرتی ہے۔ اور یہ کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے کہ ''جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں'' ویسے وہ حرکت وعمل کے جذبے سے اس قدر سرشار تھا کہ زمین و آسمان کی خواہ مخواہ کی تمیز بھی روا نہیں رکھی۔

بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیر پر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

لہٰذا ''آن سوئے افلاک'' ہو یا وادی ''ہمالہ'' اقبال کے پیغام عمل کی بات کرتے ہوئے کوئی بنیادی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس نے ہمیں نیکی و بدی کے سوا بقیہ ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہونے اور ان قیود سے اوپر اٹھنے کا درس دیا ہے

۔

عالم اسلام کو براہ راست خطاب کرنے والے اقبال نے پورے عالم انسانیت کو نسلی، گروہی اور علاقائی رقابتوں سے بالاتر ہونے کا جو پیغام دیا ہے محض شعرو

شاعری کی حد تک نہیں ہے۔ وفات سے تین ماہ قبل یکم جنوری ۱۹۳۸ء کا نشری پیغام خالص نشری پیغام تھا۔ اور وہ آفاقیت کے معاملے میں اس کے ''پس چہ باید کرد'' والے اس شعری پیغام سے چنداں مختلف نہیں ہے کہ جس میں اس پورے برصغیر کو ''اے ہمالہ اے اطلک اے رود گنگ'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''ہمالہ'' اقبال کے کلام میں گھوم پھر کر بار بار آتا ہے۔ اور اب تو یہ محض ''فصیل کشور ہندوستان'' ان معنوں میں نہیں رہا جن معنوں میں ربع صدی قبل رہ چکا ہے سلسلہ وار اب یہ کئی کشوروں کی فصیل بن گیا ہے۔ اور اس اعتبار سے اسے کچھ زیادہ ہی معنوی وسعت نصیب ہو چکی ہے۔ ہاں اس عظیم سلسلہ کوہستان کے بارے میں اقبال کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ قدامت کے باوجود اس کے فطری احوال جوں کے توں تازہ ہیں۔ اسے دیکھ کر آدمی اپنے من کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عناصر اور قدرتی واردات کا یہ ہنگامہ زار صدیوں سے اسی طرح باوقار و پرتمکنت ہے۔ منظر ہمالہ کی فطری سادگی و پرکاری کا راز بالآخر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حال کا رشتہ ماضی سے منقطع نہ ہو اور جدید کو قدیم سے بےگانہ نہ ہونے دیا جائے۔ فطرت سادہ کا روئے زیبا غازہ تکلف سے داغدار نہ ہو۔ لسانی اور علاقائی تعصب انسانی برادری کو پارہ پارہ نہ کرے۔ خلا نورد نئے نئے سیارے دریافت کرتے رہیں مگر اپنی پیاری زمین کو نہ بھولیں کہ حیات مابعد کی کھیتی بھی یہی ہے اور ہم جو کی کاشت کے لیے جو اور گندم کی فصل کے لیے گندم یہیں بو سکتے ہیں۔ سعدی کی طرح اقبال کے نزدیک بھی ''با آسماں

پرداختن'' کا مقصد ''کارزمیں رانکو ساختن'' ہے اور یہی ہے وہ ارضی افادیت جو اقبال کی افادیت کو شبلی کی ماورائیت سے جدا کرتی ہے۔ ان ابتدائی معروضات کی روشنی میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا جائزہ دلچسپی اور افادیت سے خالی نہ ہو گا۔ مضمون زیرِ نظر میں صرف اُردو کلام کے سرسری جائزہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اقبال کے اولیں مجموعہ کلام میں ''بانگ درا'' میں ''با آسماں پرداختن'' و ''کارزمیں رانکو ساختن'' کے موضوع پر ''ہمالہ'' سے گزرنے کے بعد ''ابر کہسار'' پر ہماری نظر ٹھہرتی ہے۔ اس کا مرکزی خیال زمین کو گلزار بنانا اور حیات انسانی کو آسائشوں سے مالا مال کرنا ہے۔ ''ابر کہسار'' بزبان حال کہتا ہے:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا

اور

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں میں
جھونپڑے دامن کہسار میں دہقانوں کے

یہ ہے فی الحقیقت ہر باشعور فرد کو اس بات کا درس کہ بلند سے بلند مرتبہ حاصل کرنے کا مقصد اہل عالم کے لیے فیض عام ہے۔

اس کے بعد سنسکرت نظم ''گایتری'' کا ترجمہ ''آفتاب'' سامنے آتا ہے۔ خطاب کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے۔

اے آفتاب روح و روان جہان ہے تو

اور پوری نظم اس نکتہ خاص کی تشریح ہے کہ آفتاب عالم تاب عظیم بلندی کے باوجود کس کس طرح زمین کے لیے سرچشمہ حیات ہے۔ اقبال نے یہاں زمین سے بلندی زمین سے بیزاری کے مترادف نہیں بلکہ آفاقی فیض رسانی کے ہم معنی ہے۔

نظم ''ایک آرزو'' کے ابتدائی شعر سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاعر عام سماجی زندگی سے بیزار ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شعر جیسے غالب کے اس شعر کا چربہ ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ہاں اقبال بھی یہی کہتا ہے

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

مگر نظم غالب سے نظم اقبال کو جدا کرنے والی بات اتنی واضح ہے کہ اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ غالب کی نظم ایک لیٹی ہوئی ذی فراش نظم معلوم ہوتی ہے۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اس کے مقابلے میں اقبال کی نظم ایک کھڑی نظم ہے۔ اس میں ایک حرکت ہے

ایڑیاں رگڑنے والی، گھسٹنے والی یا مرغ بسمل والی افقی حرکت نہیں، بلکہ تازہ دم ہو کر اٹھنے اور اٹھانے والی عمودی حرکت ملاحظہ ہو ان اکٹھے چھ مصرعوں میں ہر شے اوپر اٹھی ہوئی اٹھتی ہوئی اور اٹھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہسار ہے ت بلند قامت، پانی ہے تو ہو موجزن، نالہ ہے تو آسمان گیر، سوئے ہوئے لوگ ہیں تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہونے والے، غرض یہ کہ شاعر کی آرزو فرسودگیوں سے بالاتر ہونے اور دوسروں کو بالاتر کرنے کی آرزو ہے۔

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو اس کی صدا درا ہو
ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
خاموش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

نظم ''آفتاب صبح'' میں اگرچہ بظاہر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کو زمین کے ہنگاموں سے بلند اور بلند سے بلندتر ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے

شورش میخانہ انساں سے بالاتر ہے تو
زینت بزم **فلک** ہو جس سے وہ ساغر ہے تو

لیکن آفتاب صبح کی اس ادائے خاص کو انسان کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ جہاں وہ ''زینت بزم **فلک**'' ہے وہیں اہل زمین کے لیے

سرچشمہ حیات بھی ہے۔

زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے
آرزو ہے کچھ اسی چشم تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیاز ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

آفتاب کے لیے باعث فضیلت زمین سے اس کی مسافتی بلندی نہیں بلکہ نیر اعظم کی عظمت دراصل اس میں ہے کہ ہنگامہ عالم خاکی کے لیے وہ ہمہ دم زحمت کش رہے۔

تو اگر زحمت کش ھنگامہ عالم نہیں
یہ فضیلت کا نشاں اے نیر اعظم نہیں

بات یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک انسانی فطرت کی بلندی کا راز جذبہ عشق میں مضمر ہے۔ ایسی بلند خیالی کس کام کی جو دوسروں کے دکھوں کا مداوا دوسروں کو پستی سے نکالنے والی نہ ہو۔ شیخ چلی کا منصوبہ باندھنے والے اور خیالی پلاؤ پکانے والے منموجیوں سے یہ توقع ہی فضول ہے کہ وہ انسانی معاشرے کو فرعونوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے کوئی اعجاز کلیمی دکھائیں گے۔ اس قماش کے دانشوروں کی پرواز تخیل کو اقبال خاطر میں نہیں لاتا۔

رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو

ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

اقبال کے نزدیک شانِ کلیمی اس میں ہے کہ جذبہ عشق کی بلندی نصیب ہو اور تڑپ دل میں اس کی ہو کہ ابنائے جنس کو باطل کے شکنجے سے نکال کر حق کی آزاد فضا میں پہنچا دیا جائے

اہل دنیا کے لیے اجرام فلکی می سورج کے بعد چاند ہی بلندی کے دوسرے مقام پر فائز ہے۔ مگر چاند ابنائے عالم کے دکھ درد سے اگر آشنا نہیں تو اس اہل دل بندہ خاکی پر سے اسے کس طرح فوقیت حاصل ہو سکتی ہے جو دوسروں کے دکھ درد سے بھی آگاہ ہو اور ان کی خیر خواہی کے لیے ہمہ دم مستعد بھی ہو۔ ماہتاب کی تابانی اور تابناکی سے اقبال کو انکار نہیں مگر اس کے مقابلے میں تحدیث نعمت ان الفاظ میں کرتا ہے۔

پھر بھی اے ماہ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

چاند کے بعد ستارے کا نمبر آتا ہے۔ اور ستاروں میں ''صبح کا ستارہ'' خاص

مرتبہ رکھتا ہے۔ مگر اقبال کا اعجازِ فن ملاحظہ ہو کہ وہ صبح کے ستارے کی قدر و منزلت اس کی آسمانی بلندی میں نہیں کرتا بلکہ اشک محبت کے ٹپکتے ہوئے قطرے کو اس کے لیے باعث رشک تصور کرتا ہے۔ دیکھیے اقبال کی زبان میں ''صبح کا ستارہ'' کیا کہتا سنائی دیتا ہے۔

لطف ہمسائیگی شمس و قمر کو چھوڑوں
اور اس خدمت پیغام سحر کو چھوڑوں
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی
اس بلندی سے زمین والوں کی پستی اچھی
اشک بن کر سرمژگاں سے اٹک جاؤں میں
کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں
جس کا شوہر ہو روں ہو کے زرہ میں مستور
سوئے میدان دغا حب وطن سے مجبور
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں
ساغر دیدہ پر نم سے چھلک ہی جاؤں
خاک میں مل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

اور ''بانگ درا'' کے دور اول کا خاتمہ ''کنار راوی'' پر ہوتا ہے۔ مقبرہ جہانگیر کے بلند میناروں کا منظر فکر اقبال کو تاریخ کے اس روشن دور میں پہنچا دیتا ہے جو

فطرت انسانی کی بلندی کا ایک مثالی دور تھا (وہ ایک ایسے مردِ حق کا بھی دور تھا.....

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

یعنی مجدد الف ثانیؒ)..... نظم کنار راوی کا یہ شعر اقبال کی فن کاری کا بڑا اچھا نمونہ ہے.....

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی

منار خوابگہ شہسوار چغتائی!

غالباً ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اقبال ریویو میں شائع ہونے والے مقالے میں اس کی نشاندھی کی تھی کہ اس شعر میں ''عظمت'' کے ''ظ'' کی اٹھان سے لے کر آخر تک متواتر ''الف'' کی وہ کثرت ہے کہ خطی اور صوتی دونوں اعتبار سے بلندی کا تاثر بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

عظمت فزائی تنہائی ' منار خوابگہ شہسوار چغتائی

ممکن ہے یہ محض حسن اتفاق ہو۔ مگر آمد اسی کا نام ہے۔ اگر یہ آمد نہیں آورد اور تصنع ہے تو ہزار صنعتیں اس پر قربان! اور میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی نکتہ رس نگاہ کو خراج تحسین ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بانگ درا کے دوسرے دور میں اقبال کے علوئے فکر اور عروج فن کا ایک مثالی نمونہ اس کی نظم ''محبت'' ہے۔ ملاحظہ ہو محبت باہمی کا مقام بلند.....

سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا

صفا تھی جسکی خاک پا میں پڑھ ک ساغر جم سے

لکھا تھا عرش کے پائے میں اک اکسیر کا نسخہ
چھپائے تھے فرشتے جس کو چشم ابن آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے
پڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعی پیہم سے

اور جب اس نسخے کے مطابق اجزا فراہم ہوئے اور محبت کا محلول تیار ہوا تو.....

مہوس نے یہ پائی ہستی نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کار عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

دور اول کے ''ستارہ صبح'' کے مقابلے میں دور ثانی کے ''اختر صبح'' میں ٹپکنے والے اشک محبت کی بات تو نہیں مگر اس کی پابندگی کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ شاعر محبت کے ریاض سخن پر ٹپکنے والی شبنم کے ساتھ وہ بھی ٹپک جائے.....

ستارہ صبح روتا تھا اور یہ کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصت نظر نہ ملی
کہا یہ میں نے کہ اے زیور جبین سحر
غم فنا ہے تجھے ' گنبد فلک سے اتر

ٹپک بلندی گردوں سے ہمرہ شبنم
مرے ریاض سخن کی فضا ہے جان پرور
میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثال ابد پائیدار ہے اس کی

یعنی ''اختر صبح'' کو بقائے دوام محض آسمانی بلندی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہاں شاعر کا اعجاز فن اسے لازوال بنا سکتا ہے

غم فنا ہے تجھے گنبد فلک سے اتر
بات عجیب ہے مگر کسی قدر سچی!

نظم ''کلی'' میں بات اس طرح شروع کی گئی ہے کہ جب سورج کی روشنی پھیلتی ہے تو کلی اپنا سینہ کھول کر اس کے نور کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر شاعر کے دل میں تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ آسمانی خورشید کی طرح عالم مثال میں شاعر کا بھی اپنا خورشید ہو۔ وہ اس میں ضم نہ ہو جائے بلکہ دور ہی سے کسب ضیا کرے۔

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں
صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں

کیا یہ ماورائیت ہے؟ عہد جدید کی ماورائیت دراصل وہ ہے جس کا رونا اقبال کے ان اشعار میں روتا ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال تو فیضان سماوی سے بہرہ ور ہو کر حیات ارضی کو روشن اور منور کرنے کا قائل ہے اور جگہ جگہ نت نئے پیرائے میں اسی کی تلقین کرتا ہے زمین سے فرار کی بات اقبال نہیں کرتا۔ وہ تو سورج چاند اور ستاروں کو بھی زمین پر کھینچ لانے کی بات کرتا ہے۔ یہاں تو ستارے بھی رک کر عظمت انسانی کو خراج عقیدت پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں بانگ درا کا تیسرا دور ''گورستان شاہی'' کا یہ منظر پیش کرتا ہے۔

گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لیے
فاتحہ خوانی کو یہ ٹھیرا ہے دم بھر کے لیے
رنگ و آب زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں
ہے تو گورستان مگر خاک گردوں پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے ۔

اور پھر رجائیت کے پہلو کو اس طرح اجاگر کیا گیا ہے ۔

دھر کو دیتے ہوئے موتی دیدہ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گزرتے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کے آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینہ خاموش میں

وادہ گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چکا گو قوم کی شان جمالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جلالی کا ظہور

تارے کا خراج عقیدت عظمت انسانی کے آگے تو اس طرح پیش ہوا چاند بھی انسان کے خاکی مسکن کا مسلسل طواف کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے
طوف حریم خاکی تیری قدیم خو ہے
تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں
پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں

لیکن آگے چل کر ''بزم انجم'' کا نغمہ اقبال نے ایک اور مقصد سے سنایا ہے جب ''غوغائے زندگی'' مفقود ہو اور انسانوں کی بستی شہر خموشاں بنی ہوئی تو اسے جھنجھوڑنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بزم انجم کے خاموش نغمے سے اقبال نے یہاں سحر طرازی کا یہی کام لیا ہے۔

اے شب کے پاسبانو اے آسماں کے تارو!
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمہاری

آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمہاری

اور پھر بزم انجم کا نغمہ اہل دنیا کو زمانے کے نئے نئے تقاضوں کے ادراک، حرکت پیہم، آفاقیت اور یک جہتی کا درس ان الفاظ میں دیتا ہے۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا
قسمیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہیں ہم چھوٹی سی زندگی میں
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

سطح زمین پر جاہلیت کے ہاتھوں انسانی زندگی کی ویرانی کے بارے میں شبنم کا ستاروں کو یہ بتانا بڑا عبرت آموز ہے کہ

اے تارو نہ پوچھو چمنستان جہاں کی
گلشن نہیں اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی

ظاہر ہے کہ اقبال کا یہ پیرایہ سخن محض احساس زیاں دلانے کے لیے تھا۔ جب انتشار اور بحران کی کیفیت طاری ہو تو فکر و نظر کی پریشانی اور خام خیالی سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا مداوا یہی ہے کہ دو ٹوک انداز اور واشگاف الفاظ میں حقیقت بیانی کی جائے۔ ملاحظہ ہو ایک مکالمہ

اک مرغ سرا نے یہ کہا مرغ ہوا سے
پردار اگر تو ہے تو کیا میں نہیں پردار؟
مجروح حمیت جو ہوئی مرغ ہوا کی
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتار دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد تو بھی ہے
حد ہے تری پرواز کی لیکن سر دیوار

بانگ درا کے تیسرے دور کا نقطۂ عروج ''شب معراج'' ہے۔ معراج محمدی فکر انسانی میں انقلاب عظیم کا واقعہ تھا۔ اس نے نہ صرف دنیا کے سیاسی نقشے کو بدل ڈالا اپنے نقوش دنیا بھر کی تہذیب و ادب پر ثبت کیے۔ مگر افسوس کہ خود مسلمانوں نے معراج محمدی کی ثقافتی اور انقلابی اہمیت کو فراموش کر دیا۔ اقبال نے اس بھولے ہوئے سبق کو پھر یاد دلایا ہے۔

رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

''معراج'' اور ''جبریل'' میں ایک خاص مناسبت ہے۔ اقبال کے دوسرے

اردو مجموعہ کلام کا نام ''بال جبریل'' فکر اقبال میں بلندی کے تصور کی ایک واضح علامت ہے۔ سرورق کے شعر

اٹھ کے خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختہ شام و سحر تازہ کریں

کے بارے میں وپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حیات ارضی کے لیل ونہار کو تازگی عطا کرنے کے لیے خورشید کے سامان سفر کی بات کی گئی ہے۔ ''بال جبریل'' کی ابتدائی غزلوں میں ایک غزل کا مطلع ہے۔

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ

بار آور درخت تک اگر نظر اور ہاتھ کی رسائی نہیں ہوتی تو قصور اپنا ہے۔ درخت کا نہیں۔ احساس محرومی احتساب نفس اور اصلاح حال کا نقطہ کس نے اس خوبی سے بیان نہیں کیا ہوگا۔ نظر کی بلندی اور ثمرہ حیات تک دسترس انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ ٹھوس افادیت کا حامل بلندی کا یہ تصور ماورائیت سے قطعی مختلف ہے۔ بلندی تو بلندی ''پستی'' کے روشن امکانات سے بھی اقبال بے خبر نہیں۔ دیکھیے کن الفاظ میں ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''۔

خورشید جہانتاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

زمین پر پھینکے جانے کے باوجود اگر آدم آنکھ کھول کر زمین فلک اور فضا اور ابھرتے ہوئے سورج کا مشاہدہ کرتا ہے تو اور معرکہ پیہم و رجا سے سبق اندوز ہوتا ہے تو کوہ و صحرا اور سمندر اور بادل سب کچھ اس کے تصرف میں آ سکتا ہے ۔ اسی سیاق میں غزل کے یہ اشعار بخوبی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اقبال کے نزدیک مقامات دو ہی ہیں۔ مقام بلند یا مقام پست ۔ ایسا کوئی درمیانی مقام نہیں ہے جہاں زندگی بالکل معلق ہو۔ یا تو شرر سے ستارہ اور ستارہ سے آفتاب تک مسلسل حرکت ہوگی یا عالم ہستی میں مکمل جمود۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل!
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

اقبال اول الذکر کو ''شیوہ مرداں'' اور ثانی الذکر کو ''کیس گوسفنداں'' قرار دیتا ہے۔

وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مال و نباتات و جمادات

خوشحال خان کے آخری کلمات شیوہ مرداں ہی پر دلالت کرتے ہیں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اقبال وسعت پرواز اور پرواز میں امتیاز نہیں کرتا وہ تو صاف کہتا ہے کہ

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہین وار
شکار تازہ کی لذت سے بے نصیب رہا

دونوں کا ''حال و مقام'' اس شعر سے بھی بخوبی ممیّز ہوتا ہے

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

کرگس تو کرگس اقبال کا شاہیں چکور کو بھی خاطر میں نہیں لاتا کیونکہ اس کا منتہائے نظر صرف چاند ہے۔

یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

زمین پر رہتے ہوئے ستاروں پر کمند ڈالنے اور محض زمین کا کیڑا بنے رہنے میں بڑا فرق ہے اور یہ فرق زمین و آسمان کا فرق ہے۔ روٹی انسان کے لیے ضروری ہے مگر فیضان سماوی کے بغیر محض روٹی کے سہارے انسان بحیثیت انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ چیونٹی اور عقاب کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔ چیونٹی کہتی ہے۔

میں پائمال و خوار و پریشان و رد مند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب جواب دیتا ہے۔

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

اقبال کا یہ خیال ہے کہ یہ علوہ بلندی خودی میں ڈوبنے سے حاصل ہوتی ہے۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام و سحر سے بیکراں ہو جا

''خودی میں ڈوبنے'' کی بات اقبال نے ایک مصرعے میں کہی ہے اور حلقہ شام وسحر سے نکل کر بے کراں ہو جانے کی بات دوسرے مصرعے میں اور دونوں مصرعے بظاہر دولخت معلوم ہوتے ہیں لیکن خودی میں ڈوبنا اور پھر ابھر آنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر آتے ہیں
مگر یہ حوصلہ مرد ہیچ کارہ نہیں!

ضرب کلیم کے سرورق پر یہ شعر اسی نکتے کو واضح کرتا ہے۔

ہزار چشمے ترے سنگ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

بانگ درا کی شب معراج کے مقابلے میں ضرب کلیم کی معراج خاصی زوردار

ہے۔ایک ذرہ ناچیز کی جوہری توانائی کائنات میں ہلچل مچا سکتی ہے۔

دے ولولہ شوق جسے لذت پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج
ناوک ہے مسلماں ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سر سرا پردہ جاں نکتہ معراج

یہ اشعار جوہری عہد کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ ہزار حیف کہ مسلمان ہی اس قسم کے اشعار کی گہری معنویت سے بے خبر ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے ہمیں
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

جوش عزیمت ہو تو بلند و پست کا امتیاز بھی محض اضافی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔دیکھیے اقبال کس طرح زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے.....

شاید یہ کہ زمین ہے یہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

بندہ مومن کی شان اقبال نے یہ بتائی ہے کہ نہ تو وہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا پرست ہے اور نہ جنت میں پہنچ کر جنتی لذتوں میں غرق ہو جانے والا ہے۔ دنیا میں اس کا یہ حال ہے.....

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حما م اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن
اور جنت میں اس کا یہ وطیرہ ہو گا.....
کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

تسلیم و رضا یقیناً شیوہ مومن ہے مگر اقبال کے نزدیک ذوق عمل ہرگز تسلیم و رضا کے منافی نہیں۔ نباتاتی زندگی کو جگہ جگہ اس نے بلاشبہ جمود کا نمونہ قرار دیا ہے لیکن نباتاتی نشونما سے وہ صرف نظر نہیں کرتا اور تسلیم و رضا کا حرکی تصور وہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

ہر شاخ سے یہ نکتہ پیچیدہ ہے پیدا
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدہ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہ عمل بند
مقصود ہے کچھ اور تسلیم و رضا کا
جرات ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

یقیناً اقبال حرکت و جمود کی اضافیت کا راز پا گئے تھے۔ آگاہ تو وہ اس سے بھی

تھے کہ خودی کی قوت تسخیر کے آگے بلندی افلاک ہیچ ہے۔

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکت صبح و شام سے آگاہ

بلندی خودی کا جب یہ مقام حاصل ہو تو قوت پرواز جواب نہیں دے سکتی۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پردم ہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد

کائناتی بلندی و پستی کو وہ خوب و ناخوب کا معیار قرار نہیں دیتا کیونکہ اس کے نزدیک فی الواقع خودی کی بلندی و پستی ہی معیار خیر و شر ہے

نمو جس کی فرا زخودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

محکوم مسلمان کو اگر اپنی پستی خودی کا احساس ہو تو مسجد قوت اسلام کی بلندی اسے شرمسار کیے بغیر نہیں رہتی۔

ہے مری بانگ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود؟

اقبال اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ زمین پر رہتے ہوئے بھی زمین کی رعنائیاں ہمیں اگر اپنے اندر جذب نہ کریں تو اپنی قسمت کو بلند تصور کرنا چاہیے۔

کھینچیں نہ اگر تجھ چمن کے خس و خاشاک
گلشن بھی ہے اک سر سراپردہ افلاک

نظم صبح چمن پھول شبنم اور صبح کا مکالمہ ہے۔ صبح کہتی ہے کہ زندگی میں لطافت فیضان سماعی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

مانند سحر صحن گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہ پا گوہر شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن
ہاتھوں سے ترے دامن افلاک نہ چھوٹے

اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مفکر ہونے کے باوجود اقبال بہر حال ایک فن کار ہے اور ہر فن کار کے یہاں تھوڑا بہت جزوی اور وقتی تضاد ہوتا ہے۔ جوئے نغمہ خواں کا وہ مداح ضرور ہے مگر خوب سے خوب تر اگر اس کے پیش نظر ہو تو وہ اول الذکر کو ناخوب کہنے سے بھی نہیں چوکتا۔

یہ آبجو کی روانی، یہ ہمکناری خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
ادھر نہ دیکھ ادھر دیکھ اے جوان عزیز
بلند زور دروں سے ہوا ہے فوارہ!

جس طرح خوب و رشت کا معیار اقبال نے خودی کی بلندی و پستی کو قرار دیا ہے جلال و جمال کا معیار اس کے نزدیک یہ ہے کہ جلال بدرجہ کمال ہو اور افلاک بھی اس کے آگے سرنگوں ہو۔

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی

کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

اس ذوق جمال کا تعلق بھی خودی کی سربلندی سے ہی ہے جس کے آگے نہ صرف آسمانوں کی بلندی ہیچ ہے بلکہ بقول غالب عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا۔ نظم ''ذوق نظر'' مصرعہ غالب کی شرح معلوم ہوتی ہے۔

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے صیاد سے دم تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دلکشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکی شمشیر

بلندی کے مخصوص بامقصد تصور کو سامنے رکھ کر اقبال کے فکر و فن کا یہ سرسری سا جائزہ بھی اس بات کو سمجھنے کے لیے غالباً کافی ہے کہ شرر سے ستارہ اور ستارہ سے آفتاب قطرہ سے آبجو اور آبجو سے فوارہ خوب سے خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین وادی ایمن کے طور اور طور سے برق تجلی تک بلندیوں کے درجات طے کرتے ہوئے اقبال کا ذہن ماورائی یا فراری ذہن نہیں ہے بلکہ ارتقائی ذہن ہے اور اس اعتبار سے اس کی شاعری جزو بست از پیغمبری اور ضرب کلیم کا نقطہ عروج اس کا یہ شعر ہے۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

☆☆☆